انڈونیشیا اور اسلام

از جناب محمد فیاض صاحب

خلیج بنگال سے پرے جنوب مغرب کی سمت بحرِ ہند میں خطِ استوا پر حلقہ کئے ہوئے جزیروں کی ایک ہری بھری دنیا بستی ہے، عرصہ تک جغرافیہ کے طالب علم اس خطہ کو جزائرِ شرق الہند یا ڈچ ایسٹ انڈیز کے نام سے جانتے رہے ہیں، دوسری عالم گیر جنگ کے بعد ہمارے کرّہ نے کسمسا کر جو اپنا جغرافیہ بدلا تو بہت سی نئی سرحدیں اُبھریں اور دنیا کے نقشے پر بہت سے علاقوں نے اپنا رنگ بدل دیا۔ جزائرِ شرق الہند نے بھی ہالینڈ کا نوآبادیاتی پیلے رنگ کا چولا اتار پھینکا اور آزاد ملک کا اپنا گہرے سبز رنگ کا جامہ پہنا ڈچ ایسٹ انڈیز کی جگہ پر انڈونیشیا کے نام سے ایک نئی جمہوریہ قائم ہوئی دنیا نے سمجھا کہ اس کی تاریخ میں ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا لیکن انڈونیشیا کی اپنی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نسلِ آدم۔

ڈارون کے نظریہ سے شغف رکھنے والے "آدم جاوا" JAVA MAN کے نام سے ضرور واقف ہوں گے، آدم جاوا اس نظریہ کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی فراہم کرتے ہیں اور موجودہ نسلِ انسانی کو سب سے پہلے دُم گرا کر جنگل سے نکلنے والے انسان نما جانور سے قریب ترین لے جاتے ہیں، سائنس داں آدم جاوا کو PITHECANTHROPUS کہتے ہیں جو چین کے SINANTHROPUS اور یورپ کے NEANDARTHAL MAN دونوں سے عمر میں بڑے تھے، وہ اگر اس وقت زندہ ہوتے تو ان کی عمر پانچ لاکھ سال کی ہوتی، آج سے پانچ لاکھ سال پہلے کیا ہوا کون جانتا ہے البتہ قیاس ہے کہ کم از کم چالیس ہزار سال پہلے ان جزیروں میں انسانی آبادی پائی جاتی تھی۔

انڈونیشیا کے قدیم باشندے سیاہ فام ناٹے قد کے گھنگھرالے بالوں والے حبشیوں سے ملتے جلتے آدمی تھے

اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں ان جزائر میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کی مجموعی تعداد جزیروں کے رقبے کو دیکھتے ہوئے اتنی قلیل تھی کہ آبادی کا تصور جیسا کہ آج کل ہمارے ذہن میں ہے اُس وقت ناممکن تھا۔ قدیم نسل کے یہ باشندے اب بھی تہذیب سے بہت دُور ادی باسی زندگی بسر کرتے ہوئے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، دورِ مسیحی کے آغاز سے ایک ہزار سال پہلے موجودہ انڈوچائنا کے خطے سے منگول نسل کی ایک شاخ کے لوگ مہاجرین کی صورت میں متعدد قافلوں میں نئے آب و دانے کی تلاش میں جنوب کی طرف روانہ ہوئے اور برما اور جزیرہ نما ملایا کی راہ سے مجموعہ الجزائر تک پہونچے، ان قافلوں سے کچھ تو ملایا کے سرسبز و شاداب علاقے میں بس گئے اور کچھ نے آگے بڑھ کر سمندر پار جزیروں میں بود و باش اختیار کر لی۔

آج سے تین ہزار سال پہلے کی تاریخ پر قدامت کی دھند چھائی ہوئی ہے اگر آپ مزید جاننا چاہتے ہیں تو دیومالا کے تخیل کا سہارا لینا پڑے گا، کہتے ہیں کہ سیدھے سادھے بھولے بھالے انسانوں کا قافلہ جس وقت ملایا کی سرحد پر آکر رُکا اُس وقت ہمالیہ کے دیواستان سے ایک دیوتا اپنے آسمانی سفر پر ادھر سے گزر رہا تھا اس نے ان لوگوں پر مسکرا کر نظر ڈالی اور جیسا کہ دیوتاؤں کا قاعدہ ہے اُس نے ان کی قسمت بھانپ لی اور خوشی کی لہر میں آکر اپنے گلے سے زمرد کی مالا اُتار کر سمندر میں پھینک دی جو اُن کے قدموں پر آکر گری۔ مجمع نے ایک صدائے آفریں بلند کی کسی نے کہا "وہ دیکھو!" لوگوں نے دیکھا دُور افق پر جزیروں کی ایک دنیا خالی پڑی بود و باش کی دعوت دے رہی ہے۔ گھر کی تلاش میں سرگرداں انسانوں کو ایک نیا گھر مل گیا تھا اور کیسا گھر؟

موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے تین ہزار جزیرے تقریباً تین ہزار میل کی لمبائی میں پھیلے ہوئے۔ کچھ اتنے چھوٹے کہ کسی کو نام دینے کا بھی خیال نہ آیا اور جہاں چند درختوں کے علاوہ آبادی کی گنجائش نہیں اور سب سے بڑا بورنیو جو اگر آسٹریلیا کو براعظم مان لیا جائے اور گرین لینڈ کو برف سے ڈھکے ہوئے تین الگ الگ جزیرے تو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہی پھر اس گھر میں قدرت کا دیا سب کچھ ہے یہاں وہ تمام قدرتی وسائل موجود ہیں جو دنیا میں ہمیشہ سے قوموں کے لئے عظمت اور ترقی کے ذرائع ثابت ہوئے ہیں۔ اس زمین کا سینہ ہیرے، سونا۔ چاندی، تانبہ، ٹن۔ لوہا۔ کوئلہ۔ تیل سے پٹا پڑا ہے، استوائی آب و ہوا کیساتھ ہمارے ذہن میں انتہائی گرمی اور شدید بارش کا جو تصور ہے وہ یہاں آکر غلط ثابت ہوتا ہے، پورے ملک میں

چند جگہوں کو چھوڑ کر کہیں بھی درجۂ حرارت سال کے کسی وقت ناقابلِ برداشت نہیں ہوتا اور نہ بارش غیر معمولی طور پر موسلا دھار، خاص طور پر پہاڑی مقامات پر (اور یہاں ہر جزیرے کے بیچوں بیچ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے) آب و ہوا خنک اور دلفریب ہے، زمین اتنی زرخیز کہ ہر چیز اُگتی ہے اور شدت سے اگتی ہے، یہاں خزاں نہیں ہوتی، سبزہ و درخت سب سدا بہار رہتے ہیں، یہ ملک اور خصوصاً جاوا اور بالی کے جزیرے قدرتی مناظر کی جنت ہیں، سماترا میں گھنے جنگلات دیوقامت درختوں کی ایک ناقابلِ عبور دیوار کی طرح کھڑے ہیں، جاوا میں دھان کے زینہ دار کھیت نہ جانے کب سے فنکاروں کیلئے موضوعِ تصویر مہیا کر رہے ہیں، ناریل، سپاری چائے، قہوہ، ربر، تمباکو، گنّا، یہاں سب کچھ پیدا ہوتا ہے اور افراط سے، سب سے بڑھ کر یہاں کے مسالے ہیں، سیاہ مرچ، لونگ، جائفل، جاوتری، جن کی خوشبوؤں نے دنیا کے کونے کونے سے تاجروں کو یہاں کھینچ بلایا، ان مسالوں کی تجارت اور اس تجارت کے منافع کی تلاش میں اس سرزمین میں چینی، ہندوستانی، عرب فرانسیسی، پرتگالی، انگریز اور ولندیزی سبھی کا گذر ہوا۔ یہاں آئی چنگ، مارکوپولو اور ابنِ بطوطہ بھی آچکے ہیں۔ چین کے بدھ عالم، ہندوستان کے رشی، یورپ کے مستشرقین سب نے یہاں سے فیض حاصل کیا ہے، پہلی صدی مسیحی میں ہندوستان سے ہزاروں کی تعداد میں کنبے یہاں بسنے کی غرض سے آئے، کبلائی خان کے سپاہیوں نے خانِ اعظم کا دبدبہ قائم کرنے کیلئے یہاں چڑھائی کی تو کشمیر کا ایک شاہزادہ یہاں بدھ بھکشو بن کر آیا۔ عرب اور گجراتی تاجروں نے یہاں اسلام کا پیغام سنایا تو پرتگالیوں نے یہاں صلیبی جہاد کے نعرے لگائے اور آخر میں ولندیزیوں نے اپنے گھر سے دور ایک گھر بسایا اور دنیا کی زبردست نوآبادی قائم کی، ان سبھوں کی کارگذاریوں نے انڈونیشیا کی تاریخ پر بیسیوں رنگوں کا ایک عجیب و غریب نمونہ بنایا، اس تاریخ کے صفحوں پر آپ کو فن و ہنر، ترقی و عظمت، پستی و صعوبت، امن و جنگ، دیانت، دلیری اور بزدلی و کمینگی سب ہی کی داستانیں ملیں گی۔

انڈونیشیا اپنی ۹½ کروڑ آبادی کے ساتھ دنیا کے ملکوں میں اس وقت چھٹے نمبر پر ہے، اس آبادی کے ۹۰ فی صدی سے اوپر لوگ مذہب اسلام کے پیرو اور اس لحاظ سے مسلم ممالک میں اس کا پہلا درجہ ہے، ملک کی زرخیزی اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے یہ مجموعہ الجزائر ایشیا بلکہ دنیا کے سب سے زیادہ امیر ملکوں میں شمار

کیا جاتا ہے، پچھلے ساڑھے تین سو برسوں میں دنیا کے زبردست ملکوں نے اپنی نوآبادی سے اتنا مالی فائدہ نہیں اٹھایا جتنا کہ ولندیزیوں نے انڈونیشیا سے۔

جاوا رقبہ کے لحاظ سے انڈونیشی جزائر میں بورنیو، سماترا اور ایرین (نیوگنی) کے بعد آتا ہے لیکن پورے ملک کی آبادی کے تین چوتھائی (۷½ کروڑ) لوگ اسی جزیرے پر آباد ہیں، تاریخی اعتبار سے بھی جاوا کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ زمین کی شادابی و زرخیزی اور قدرتی مناظر کی دلکشی میں شاید ہی کوئی دوسرا جزیرہ جاوا کا مقابلہ کرسکے۔ ملک کے اہم ترین آثارِ قدیمہ جاوا میں پائے جاتے ہیں تاریخ میں ملک کی سب سے زبردست سلطنت کا مرکز جاوا ہی تھا اور انڈونیشی ثقافت کو عروج اسی جزیرے پر حاصل ہوا۔ ہندو مت کا پرچار سب سے پہلے جاوا ہی میں ہوا اور مسلم مبلغ بھی جاوا ہی میں سب سے زیادہ سرگرم کار تھے سامراج کے قدم بھی سب سے پہلے یہیں جمے تھے اور آخر کار حریت کی جنگ بھی اسی جزیرے پر لڑی گئی اور قیام جمہوریہ کے بعد دارالسلطنت بھی اسی جزیرے کے جاکرتہ کو بنایا گیا، عوام میں جاوا کے باشندے پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اس جزیرے اور خصوصاً جاکرتہ میں ملک کے ہر علاقے اور دائرے کے لوگ ملیں گے۔

جاوا کی آب وہوا میں جو سلامت روی پائی جاتی ہے وہی اس کے باشندوں میں خواہ وہ کسی جزیرے سے آکر یہاں بسے ہوں ودلیعت کی ہوئی ہے۔

جاوا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک کئی طرح کا موسم ملے گا، جاکرتہ موسم کے ایک ایسے بھنور میں ہے کہ یہاں جیسے تازہ ہوا کا گذر ہی نہیں یہاں کی گرمی میں اُمس اور ایسی گھٹن ہے کہ یہاں کے باشندے اُسے صرف چھ روز برداشت کرسکتے ہیں اور ساتویں روز اتوار کو شہر سونا ہوجاتا ہے اُس روز شہر سے باہر جانیوالی سڑکوں پر ٹریفک صرف ایک راستے چلتی ہے، شہر سے باہر اور صرف دس کیلومیٹر ہٹ کر آب وہوا تبدیل ہونا شروع ہوجاتی ہے ہوا خنک اور فرحت بخش ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وسطِ جاوا میں آپ ڈیئنگ DIENG پلیٹو پہنچ جائیں تو سال کے کسی وقت برف بھی جمتے دیکھ سکتے ہیں، قدرتی مناظر بھی آپ جیسے جیسے سفر کرتے جائیں بدلتے جائیں گے۔ ساحلی میدانوں میں سبز لہلہاتے ہوئے دھان کی کھیتیاں اور دُور دُور پر کیلے کے جھرمٹوں میں چھپے ہوئے گاؤں، میدان سے ہٹ کر چٹیلی پہاڑیاں جن پر اکا دکا سینبھل کے تناور درخت

اونچی پہاڑیاں، چائے کے باغات کا دبیز مخملی غلاف اوڑھے دُھویں جیسے بادلوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی میلوں لمبی قطاروں کے ربر کے فارم، وادیوں میں ناریل کے گھنے گہرے سبز رنگ کے جُھنڈ اور پس منظر میں دھان کے زینہ دار مخملی کھیت اور ان میں پگھلے ہوئے شیشہ کی طرح جھلکتا ہوا پانی، چپہ چپہ سبز فرنوں سے بھرا ہوا۔ یہ مناظر ایسے ہیں کہ تحسین و آفریں کے الفاظ بھول کر بس دیکھتے چلے جائیے اور جب جاکرتہ کی گھٹن میں واپس آیئے تو پسینہ کی چبھن کو برداشت کرتے ہوئے جن الفاظ اور خیالات کے ساتھ جی چاہے ان مناظر کی دلفریبی اور آب و ہوا کی فرحت کو یاد کر لیجئے، البتہ یہ تاثر آپ غالباً نہ بھلا سکیں گے کہ انڈونیشی منظر میں آپ کو کوئی جگہ ایسی نہ ملے گی جہاں کا ماحول ہمالیہ کے درّوں یا وادیوں کی طرح ہیبت انگیز ہو یا جہاں آپ گرد و پیش پر نظر دوڑائیں تو دنگ رہ جائیں، یہاں قدرت ہر ذرّہ میں ایک اعتدال اور سلامت روی لئے ہوئے ہے۔ پہاڑ، دریا، جھیلیں، دلدل، وادیاں سب ایک سُبک سا حسن لئے ہوئے ہیں اور قدرت کا یہی اعتدال لوگوں کے مزاج میں جھلکتا ہے، امن پسندی، صلح جوئی، انکسار اور رواداری، انڈونیشی کی طبیعت ثانیہ ہے، ان کی چال ڈھال اور گفتگو میں ایک سلامت روی ہے جن کو دیکھ کر یورپ کے لوگوں کو صدیوں سے کاہلی اور سستی کا دھوکہ رہا ہے اور "استوائی آرام طلبی" ضرب المثل بن گئی ہے، یورپ کے نقطۂ نظر سے یہ سلامت روی بڑی صبر آزما ہے، یورپ کے لوگ اس سست رفتاری کو دیکھ کر اس سے سابقہ پڑنے پر جھنجھلا جاتے ہیں اور شاید ان کی اپنی زندگی کی ہنگامہ خیزی اور جد و جہد کے مدِنظر یہ جھنجھلاہٹ حق بجانب ہے خود انڈونیشی زندگی میں یہ اعتدال اور سکون جزوِ حیات ہے۔ غیر ملکی بھی یہاں چند سال رہ کر اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ اسے اس سست رفتاری کا احساس نہیں ہوتا۔

انڈونیشی لوگوں کی یہی امن پسندی اور رواداری تھی جس نے باہر سے آئے ہوئے ہر تہذیبی عنصر کا خیر مقدم اور ان بیرونی عناصر کو اس طرح جذب کیا کہ یہاں پہونچ کر ہر چیز انڈونیشی سانچے میں ڈھل گئی۔

اسلام

انڈونیشیا میں اشاعتِ اسلام کے ابتدائی حالات واضح نہیں ہیں اس موضوع پر بیشتر مواد ولندیزی زبان میں ہے، بھاشا انڈونیشیا اور جاوانی زبان میں جو کچھ ملتا ہے وہ تاریخ سے زیادہ معجزات اور کرامات کے بیان سے بھرا ہوا ہے، ابتدائی تاریخ کے موضوع پر کچھ نسخوں کا حوالہ قدیم تذکروں میں ملتا ہے لیکن وہ نسخے دستیاب نہیں ہیں، یورپی مورخین نے جزیرہ نما ملایا اور مجموعہ الجزائر سے بڑی تعداد میں کتابیں جمع کی تھیں ان میں سے وہ تو ایمسٹرڈام، جرمنی، آکسفورڈ اور یورپ کے دوسرے بڑے کتب خانوں میں ملتی ہیں اور بقیہ کا پتہ نہیں، انڈونیشیا میں ولندیزی کمپنی کے عہد میں حکومت نے ایک قانون بنایا تھا جس کی رو سے ہر باشندے کا فرض تھا کہ وہ قدیم نسخے حکومت کے سپرد کردے، مقصد یہ تھا کہ ایک خاص ادارہ اس سلسلے میں تحقیق و تدوین کریگا، اس تحقیق و تدوین کے کچھ نشانات تو ضرور ملتے ہیں لیکن بہت سی کتابوں کا کوئی پتہ نشان نہیں ہے، ایک عرب مصنف سید علوی بن طاہر الحداد کا کہنا ہے کہ فتح غرناطہ کے بعد یورپ میں جو ہولی اسلامی تصانیف کے ساتھ کھیلی گئی کچھ اسی قسم کی واردات مشرقِ بعید میں بھی پیش آئی۔

پورے طور پر معلومات دستیاب نہ ہونے کے نتیجے میں ابتداء میں اشاعتِ اسلام کے بارے میں ایک دلچسپ سہ رخی اختلاف پایا جاتا ہے، عرب مورخین کا دعویٰ ہے کہ انڈونیشیا میں اسلام عربوں کے ذریعے پھیلا۔ انڈونیشی مورخین کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اسلام یہاں ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ پھیلا اور یہ ہندوستانی تاجر زیادہ تر گجرات (ہندوستان) سے آئے تھے، پھر ایک ملاباری ڈاکٹر محمد حسین نینار جو آج کل انڈونیشی یونیورسٹی میں درس دے رہے ہیں ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام انڈونیشیا میں ملابار کی راہ سے آیا۔ گجراتی نظریہ کے حامی ڈاکٹر سوچپتو ویریو سوپارتو SUTJIPTO WIRJOSUPARTO لکھتے ہیں "گجرات کی راہ انڈونیشیا میں اسلام کے داخلہ کا ثبوت یہ بھی ہے کہ سمندر پسئی (سماترا) میں ایک مسلم راجہ کا مقبرہ سنگِ مرمر کا بنا ہے جس کے ایک پتھر میں ایک بار شگاف ہونے سے یہ راز کھلا کہ وہ کسی زمانے میں گجرات کے ایک مندر میں استعمال ہوا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راجہ نے یا اس کے ورثاء نے اس کی وفات کے بعد مقبرہ کے لئے سنگِ مرمر خاص طور پر (اپنے وطن)

گجرات سے منگایا تھا" جاوا میں ایک مسلم ولی کے قبر کا کتبہ بھی گجرات سے لائے گئے پتھر کا ہے۔ "گجراتی نظریہ" کو اس امر سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ انڈونیشیا کے مسلمان اکثریت میں گجراتی مسلمانوں کی طرح شافعی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قضیہ اور اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں، اول تو یہ کہ یہاں اشاعتِ اسلام ابتداء میں کسی منظم مذہبی تحریک کی صورت میں نہیں ہوئی اور نہ یہاں بیرونِ ملک سے کوئی وفد یا مشن اس مقصد سے آیا دوسرے یہ کہ مذہبی تبلیغ کا کسی کو خیال آنے سے قبل ہی مسلم اثرات داخل ہونا شروع ہو گئے اور ان اثرات کو لانے والے عرب، گجراتی اور ملاباری تینوں تھے، مزید یہ کہ تبلیغی سرگرمی سے بہت پہلے معاشرتی میل جول کے نتیجہ میں لوگ اسلام قبول کرنے لگے تھے۔

دورِ مسیحی کے آغاز ہی سے یہاں ہندوستانیوں کا گذر تھا، مجموعہ الجزائر تجارتی ہواؤں کے راستہ میں پڑتے تھے اس وقت بھی جبکہ دنیا خصوصاً یورپ کی حریص سامراجی دنیا ان جزائر کی بے پایاں دولت سے ناواقف تھی ہندوستانی تاجر چین جاتے ہوئے ان جزائر میں خورونوش کا سامان فراہم کرنے کیلئے منزل کیا کرتے تھے سماترا کے شمال میں جو ہندوستان سے قریب ترین جزیرہ ہے زمانۂ قدیم میں ایک چھوٹی سی ریاست پسئی یا پسئی سمندر PASAI SAMUDRA تھی، قدیم ترین اسلامی اثرات کا پتہ اسی علاقے میں ملتا ہے، یہاں تیرھویں صدی عیسوی میں لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر یقین کیا جاتا ہے۔ قدیم پسئی کا علاقہ آج کل آچے کہلاتا ہے اس علاقے کے لوگ آج بھی "کٹر" مسلمان مانے جاتے ہیں، آزادی پسندی ان کے مزاج کی خصوصیت ہے پورے مجموعہ الجزائر میں جس وقت ولندیزی راج قائم ہو چکا تھا اس وقت بھی آچے کے لوگ اپنی آزادی کی مدافعت کر رہے تھے اور ولندیزیوں کو پورے ساٹھ سال اس علاقے کو زیر کرنے میں لگے۔ ابتداء میں بیرونِ ملک سے آنے والے مسلم تاجروں کی سرگرمیاں اسی علاقے میں محدود تھیں، تجارتی آمد و رفت جب بڑھی تو ان تاجروں کی خوش حالی اور ترقی یافتہ تمدن مقامی باشندوں کیلئے باعثِ کشش ہوئے کچھ ایسے بھی تاجر ہوں گے جنھیں یہاں کے بندرگاہوں پر تجارتی ضروریات کے لئے عرصہ تک مقیم رہنا پڑا ہوگا جس کا نتیجہ بڑھتے ہوئے معاشرتی تعلقات اور ازدواج کی شکل میں ظاہر ہوا ہوگا اور قیاس ہے کہ سب سے پہلے تبدیلی مذاہب انھیں ازدواجی رشتوں کی بنیاد پر عمل میں آئی ہوگی پھر ازدواجی رشتوں اور معاشرتی میل جول کے بڑھنے پر تاجروں نے یہاں مستقل طور پر بسنا شروع کیا، جیسے جیسے انکی

دولت میں اضافہ ہوا ویسے ویسے ان کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور معاشرہ میں ان کا مقام بلند ہوتا گیا یہاں تک کہ ہندوستان کے مغربی ساحل سے آئے ہوئے ایک متمول تاجر جوہن شاہ نے ۱۲۰۵ء میں سلطان کا لقب اختیار کر لیا اس طرح انڈونیشیا کی پہلی مسلم سلطنت قائم ہوئی، سلطان ملک الصالح اسی سلسلہ کے مشہور حکمراں ہوئے ہیں جن کا انتقال ۱۲۹۷ء میں ہوا، ان کا مقبرہ ہنوز موجود ہے، کہیں کہیں ملک الصالح کو پسئی کا پہلا حکمراں تسلیم کیا گیا ہے جوہن شاہ کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے اور وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ملا باری تھے یا گجرات کے۔

مسلم راجاؤں یا سلطانوں کا یہ سلسلہ ۱۶۸۶ء تک جاری رہا جبکہ ولندیزیوں نے آخری طور پر اس علاقے کو اپنے زیر اقتدار لے لیا، اس سلطنت کے دوران میں پسئی مسلم علوم و فنون کا مرکز تھا بہت سے مبلغین نے یہاں کے علمی ماحول سے استفادہ کیا، انڈونیشیا کے مشہور علماء کسی نہ کسی وقت اس علاقے سے متعلق تھے، مذہبی علوم پر انڈونیشیا کی پہلی کتابیں یہیں لکھی گئیں، تفسیر بیضوی کے مصنف عبدالرؤف الفنسوری اور صراط المستقیم (فقہ) اور بستان السلاطین (تاریخ) لکھنے والے شیخ نورالدین الرنیری اسی علاقہ سے وابستہ تھے، جزیروں کے مابین تجارت کے ذریعہ سماترا سے مسلم اثرات جاوا اور دوسرے جزائر پر بھی پہونچے۔

جاوا میں ایک کتبے سے ۸۲-۱۰۸۳ء میں ایک فاطمہ بن میمون کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، ایک چینی سیاح کی یادداشت ہے کہ ۱۴۱۶ء میں جاوا میں مسلمان موجود تھے، جاوا میں ہندو مجاپاہت MADJAPAHIT حکومت (جو ۱۵ ویں صدی عیسوی کے آخر میں زوال پذیر ہوئی) کے آخری حکمراں کی بیوی پتری چمپا جاوائی حکایتوں کے بموجب مسلمان تھی، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جاوا میں بھی تبلیغ شروع ہونے سے بہت پہلے قبول اسلام شروع ہو چکا تھا۔

اسلامی اثرات پہونچنے سے پہلے ملک کی آبادی زیادہ تر ہندو یا بدھ مت کی پیرو تھی، ساتھ ساتھ آبادی کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو ہنوز مظاہر فطرت اور اجداد کی پرستش پر قائم تھا: تاہم جس وقت پہلے شخص نے تبلیغ اسلام کی کوشش کی تو لوگوں نے اسے موجودہ مذہب کے لئے کوئی خطرہ تصور نہیں کیا، اس کا سبب لوگوں کے مزاج کی انتہائی روادارانہ خصوصیت تھی، ایسی خصوصیت کا نتیجہ تھا کہ ہندومت کی بھی وہ شکل نہ تھی جو اس وقت ہندوستان میں پائی جاتی تھی، اس مت پر انڈونیشی رنگ اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ اسے "ہندو، جاوا" کہتے تھے

یہی نہیں بدھ مت کو بھی جو ہندوستان میں برہمنیت کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتا تھا" ہندو، جاوا نے ایسا جذب کیا کہ دونوں میں تمیز مشکل ہوگئی، اور آخر میں مہاتما بدھ کو انڈونیشیوں نے ہندو دیومالا میں دیوتا کا مقام دیدیا جاوا کے ایک بدھ راجہ نے ایک بار دو مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا" اسلام اور بدھ مت کے مقاصد درحقیقت ایک ہیں اگر فرق ہے تو صرف رسومات کا لیکن اس میں کوئی مضائقہ نہیں" (!) یہ رواداری ایک طرفہ نہیں تھی، انڈونیشی عالم ڈاکٹر سوچپتو دیریو سوپارتو لکھتے ہیں" انڈونیشیا میں اسلام کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کی تلقین کرنے والے متعصب نہیں تھے"۔ مسلم مبلغین نے لوگوں کے طرزِ معاشرت اور اُن کی قدیم روایات کا ہمیشہ لحاظ رکھا، ایک اور انڈونیشی تذکرہ نویس لکھتا ہے" ہمارے مبلغین نے روحِ اسلام کو مدنظر رکھتے ہوئے مذہب کی تبلیغ و اشاعت بتدریج کی اور ہمیشہ" اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" پر عمل کیا..... ہمارے ولیوں نے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں ہمیشہ حکمت عملی سے کام لیا اور جس قدر ہوسکا جبر و اکراہ کی راہ سے احتراز کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے عوام نے اس وقت یہ نہیں محسوس کیا کہ ان کی ہندو زندگی میں اسلام دفعتاً کسی بڑے معاشرتی انقلاب کا باعث ہو رہا ہے"۔ آنند کمار سوامی ہندستانی اور انڈونیشی فن کی تاریخ" میں لکھتے ہیں" اسلام کے پیروؤں میں مقامی (انڈونیشی) ثقافت اور طرزِ تمدن کے خلاف کوئی معاندانہ جذبہ نہیں پایا جاتا تھا، جاوانی (مسلمان بن کر بھی) جاوانی ہی رہے"۔

اس جاوانیت یا (انڈونیشیت) ہی کا نام رواداری ہے، اسی رواداری اور عدم تعصب کا نتیجہ تھا کہ اولیا کے مقبروں اور مسجدوں میں اس وقت کا مروّج طرزِ تعمیر بغیر پس و پیش روا رکھا گیا، مشرقی جاوا میں سندانگ دوہور کی مشہور مسجد نمایاں مثال ہے، اس میں مینارہ اور گنبد کی جگہ پگوڈے کے طرز کی چھت ہے۔ اور احاطہ میں جاوانی مندروں کی تعمیر کے مطابق منڈپ بنا ہوا ہے۔

انڈونیشی مزاج اور فنونِ جمیلہ مثلاً موسیقی، مصوری اور سنگتراشی کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اسلام میں ان کی جس شدت سے ممانعت ہے اس کا احساس انڈونیشی فن کاروں کو بھی قبولِ اسلام کے بعد ہوا لیکن جس طرح عرب اور دوسرے خالص اسلامی ملکوں سے ان فنون کو ملک بدر نہیں کیا جا سکا یہ انڈونیشیا میں بھی برقرار ہیں، البتہ کچھ فن کاروں نے جانداروں کی تصویریں اور نقاشی اس طرح سے بھی کی ہے کہ نزدیک

دیکھنے پر وہ پھول اور پتیوں کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں لیکن تھوڑے فاصلے سے دیکھنے پر انھیں پرجانوروں اور انسانوں کی شکلیں اُبھر آتی ہیں۔

انڈونیشی آکسٹرا (گیملان) یہاں کی موسیقی کی جان ہے، اسلام کے داخلہ کے وقت موسیقی کا انڈونیشی زندگی میں وہی مقام تھا جو روزمرہ کے دوسرے مشاغلِ حیات کا اِس کے علاوہ مذہبی رسومات میں بھی موسیقی کا بڑا دخل تھا انڈونیشی اسلام پر ایمان لانے کے بعد پرانے مذہب اور اس کی رسومات کو تو چھوڑنے پر تیار تھا لیکن موسیقی..... یہ اس کی زندگی پر چھائی ہوئی تھی، اسے نکال دیا جاتا تو پھر رہ کیا جاتا، انڈونیشی بغیر موسیقی کی ویران اور سنسان زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، نتیجہ؟ ایک گرما گرم طویل بحث جس میں موسیقی کے حامی مبلغین اور ملاؤں کی جیت ہوئی اور یہ جیت اسلام کی تھی کہ موسیقی کو خواہ وہ کسی قدر اصلاح شدہ شکل میں ہی کیوں نہ ہو روا نہ رکھنا گویا اشاعت اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا۔

ثقافت کا تیسرا جزو جو اسلام کو انڈونیشیا کی قدیم تہذیب سے ورثہ میں ملا چام پتلیوں کا ڈرامہ تھا، جس کا ادب اور موسیقی دونوں سے تعلق تھا۔ یہ فن انڈونیشیا میں دو ہزار سال پرانا ہے، یہ ڈرامے چمڑے کی بنی ہوئی پُتلیوں کو تیز روشنی کے سامنے رکھ کر سفید پردے پر اس کا سایہ گرا کر دکھایا جاتا ہے، تماشہ دکھانے والا (دالنگ) ان پتلوں کی مدد سے رامائن اور مہابھارت کے قصے گیملان آکسٹرا کی موسیقی کے ساتھ صدیوں سے عوام کو سناتا آرہا تھا، ان قصوں کی دلکشی عوام کے دلوں میں گھر کر گئی تھی، اتنے میں اسلام کا پیغام سنایا گیا، لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کی تہذیب کا یہ عنصر بُت پرستی میں شامل ہے، ہم تصور کرسکتے ہیں کہ مبلغینِ اسلام کو چام پتلی اور دیومالا کی شکل میں ایک زبردست مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا ہوگا تاہم اس کے حل کرنے کے سلسلہ میں سختی برتے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اسے مبلغین کی شکست کہا جائے یا حکمت عملی، چام پتلی اور رامائن مہابھارت کے قصے آج بھی انڈونیشیا میں اسی طرح رائج ہیں جیسے صدیوں پہلے، یہاں تک کہ فلموں کی مقبولیت کے باوجود یہ تفریح اب بھی اپنا

سے انڈونیشیوں کا دعویٰ ہے کہ چام پتلیوں کا یہ فن جسے وہ دالنگ WAYANG کہتے ہیں اُن کا اپنا ہے البتہ کچھ ہندوستانی محققین کہتے ہیں کہ ہندومت کی طرح یہ فن بھی ہندوستان سے یہاں آیا، وہ کہتے ہیں کہ مسیحی دور سے قبل موجودہ آندھراپردیش کے علاقہ میں ست واہن راجاؤں کے عہد میں یہ فن عروج پر تھا۔

مقام رکھتی ہے نرگس دمہی پال اور راک ٹدہس اور گریٹا کار بو کے دوش بدوش رام لکشمن اور ارجن وگوٹ کاچہ ہنوز جیتے جاگتے کردار ہیں۔

مبلغینِ اسلام میں سے ایک سنان کلی جوگہ KALI DJOGA نے وائنگ کے قصوں کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی پھر بھی یہ پیوند دور سے نظر آتے ہیں۔ مغربی جاوا میں اسلامی تقاضوں کے مدنظر چام پتلیوں کی جگہ کٹھ پتلیوں (وائنگ گولے) کو دی گئی اور ان کے قصے رامائن اور مہابھارت کے بجائے مشہور عربی اور فارسی حکایتوں سے لئے گئے پھر بھی جو مقبولیت چام پتلیوں کو حاصل ہے وہ کٹھ پتلیوں کو نہیں، عام انڈونیشی نے سارا مسئلہ اپنی رواجی حسن وخوبی سے یوں حل کیا کہ رامائن اور مہابھارت اور دیومالا کو اس نے مذہب اور عقیدے سے الگ ادب عالیہ قرار دیا ہی نہیں بلکہ زبان کو بھی جس نے سنسکرت اور عربی سے برابر استفادہ کیا تھا مذہب کی بنیاد پر خالص" بنانے کی کوشش نہیں کی چنانچہ آج بھی یہاں حضرت فاطمہؓ کو فاطمہ دیوی لکھا جاتا ہے اور اسے گناہ نہیں تصور کیا جاتا یہاں مسلمانوں کی جنّت بہشت نہیں بلکہ سورگ ہے اور دوزخ نرک، یہاں عرشِ بریں سورالیہ اور اللہ تعالیٰ دیوتا ملیہ رایا۔ یا تو ہاں ہنگ مہاالیہ، عالم وفاضل کو یہاں چانکیہ کہتے ہیں، پدماوتی اسلام قبول کرنے کے بعد فاطمہ بیوی نہیں بلکہ فاطمہ دتی بن گئیں پھر بھی یہاں حاجی علی شاستر دجے ادر کیاہی (مولوی) سوریہ دھرم بھی مل سکتے ہیں یہاں کبھی ہنگ محمد کے صاحب زادے ہنگ تو الکھشن کے خطاب پر نازاں تھے[۵] ان تمام غیر مسلموں کو جنھیں ہندوستان میں صرف آنجہانی لکھا جاسکتا ہے انڈونیشیا میں بلا تکلف المرحوم لکھا جاتا ہے الغرض یہاں زبان اور ادب کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

یہاں ایک بات واضح کردینا ضروری ہے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں جو امن پسندی اور رواداری برتی گئی اور بتدریج جس حسن خوبی سے یہ کام انجام دیا گیا اس کا اس تشدد سے کوئی سروکار نہیں جو مسلم سلطنتوں کے قیام کے دوران ہوا اور جس کے نتیجہ میں بہت سے ہندو جاوا چھوڑ کر جزیرہ بالی کی پرسکون وادیوں میں اپنے قدیم تمدن اور ثقافت کے ساتھ پناہ گزیں ہو گئے اور جو لوگ جاوا نہ چھوڑ سکے وہ مسلم دائرۂ اقتدار سے دور اندرونی علاقوں میں چلے گئے اور آج بھی اپنے قدیم مذہب کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں کچھ محققین تو یہاں

۵ انڈونیشی ہوائیہ میں لکھشمن کے نام سے اب بھی کئی عہدے منسوب ہیں۔

تک کہتے ہیں کہ جاوا میں ہندو سلطنت مجاپاہت کا زوال خود اس کی اندرونی کمزوری کی بنا پر ہوا نہ کہ مسلم راجاؤں کے تشدد سے۔

اولیاء جاوا تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جاوا کے نو ولی بہت مشہور ہیں ان میں سے کچھ تو محض مبلغ اسلام تھے کچھ درویش بزرگ تھے جن کی عملی زندگی کا عوام پر بہت اثر ہوا اور کچھ سیاست داں اور مجاہد تھے ان ولیوں کو انڈونیشیا میں بڑے اعتقاد اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ان کے معجزات اور کرامات کی سیکڑوں داستانیں مشہور ہیں اور ان کے مقبرے زیارتی مقام ہیں۔ ان میں سے بیشتر جگہوں پر سالانہ میلے بھی لگتے ہیں، ان سب ولیوں کا تذکرہ غیر ضروری طور پر طویل ہو جائے گا اس لئے یہاں صرف ان کا ذکر کیا جائیگا جن کے حالات اشاعت اسلام کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں گو یہ ولی عموماً جاوا سے منسوب ہیں ہم دیکھیں گے کہ ان کی سرگرمیاں محض جاوا تک محدود نہیں تھیں اور انھیں دراصل انڈونیشیا کے ولی تصور کرنا چاہیئے۔

مولانا ملک ابراہیم جاوا میں اسلام کے سب سے پہلے مبلغ مولانا ملک ابراہیم تھے جو پسئی سمندر (سماترا) سے کسی وقت چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں جاوا آئے، ان کے شخصی حالات پورے طور پر معلوم نہیں ہیں کہیں کہیں انھیں ایران سے آئے ہوئے تاجر بتایا گیا ہے۔ زیادہ تر مورخین کا خیال ہے کہ وہ گجراتی تھے، ملک ابراہیم کو جاوانی تذکروں میں "شیخ مغربی" کا لقب بھی دیا گیا ہے، جاوا آکر ملک ابراہیم نے گریسک GRESIK سے کچھ دور لوروں LORON کی بندرگاہ پر قیام کیا اور اپنے بیٹے صادق محمد کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کیا، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے صادق محمد کو جاوا کے ہندو مجاپاہت دربار میں بھی تبلیغ کے لئے بھیجا تھا اس وفد کا کیا نتیجہ نکلا، کہیں ذکر نہیں ہے، مولانا ملک ابراہیم غالباً ایک درویش صفت بزرگ تھے جن کی عملی زندگی کی خوبیوں نے ان سے ملنے والے غیر مسلموں پر کافی اثر کیا اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، مولانا نے ۱۴۱۹ء میں وفات پائی، گریسک میں ان کا مقبرہ اب بھی زیارتی مقام ہے اور بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

سُنان امپل مولانا ملک ابراہیم کے بعد سب سے بڑی تاریخی ہستی ایک رادن رحمت کی ہے، یہ سب سے پہلے ولی تھے جنھیں جاوانیوں نے سُنان[۵] کا لقب دیا۔ رادن رحمت اپنی جائے قیام امپل AMPEL کی مناسبت سے

---

[۵] لفظ سُنان مخفف ہے سوسوہنان SUSUHUNAN کا بمعنی کل مختار۔ قدیم زمانے میں یہ بڑے بڑے (باقی ص ۳۶ پر)

سنان امپل کے نام سے زیادہ جانے جاتے ہیں، رادن رحمت کے والد چمپا (موجودہ کمبوڈیا) کے عرب تاجر تھے اور رادن رحمت چمپا ریاست کی شاہزادی کے بطن سے تھے جس کی دوسری بہن جاوا کے آخری حکمران کرتاوجے KERTAVIDJAYA (۱۴۴۷ء) سے منسوب تھی، رادن رحمت نے مذہبی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی اور ہنوز بیس سال کے تھے کہ جاوا اپنے خالو کرتاوجے کے دربار آئے، کرتاوجے نے اپنے عزیز کا بڑا پُرجوش استقبال کیا، رادن رحمت کو جاوا کی آب وہوا ایسی راس آئی کہ انھوں نے وہیں مستقل سکونت کا ارادہ کرلیا، کرتاوجے نے انھیں سورابایا SURABAJA کی مشہور بندرگاہ کے نزدیک امپل کی چھوٹی سی جاگیر مرحمت کی، رادن رحمت نے وہیں ایک مدرسہ کھولا اور توبان TUBAN کے راجہ کی لڑکی نیاہی آگنگ منیلا NJAHI AGUNG MANILA سے شادی کرکے بالکل جاوا کے ہوکر رہ گئے۔ مدرسہ میں نومسلم طلباء کو دینی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ تبلیغی کام بھی شروع کیا، البتہ اُس زمانے میں تبلیغ وتلقین کی شکل کسی بڑے اجتماع کی شکل نہیں اختیار کرتی تھی بلکہ بڑے پرسکون حالات میں مسجدوں میں لوگوں کی مختصر جماعت کے سامنے ولی یا پیر مذہبی باتیں بتایا کرتے تھے، وعظ سننے والے ان باتوں کا تذکرہ اپنے کنبہ والوں اور دوست احباب سے کرتے تھے اور اس طرح رفتہ رفتہ معتقدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا اور بتدریج لوگ اسلام قبول کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ چمپا سے جاوا آتے ہوئے رادن رحمت پہلے پالم بانگ (سماترا) گئے تھے جہاں ان کے خالہ زاد بھائی آریہ ڈامر گورنر کے عہدے پر تھے رادن رحمت کی صحبت سے متاثر ہوکر آریہ ڈامر نے اسلام قبول کیا۔ ایک دوسری روایت کے بموجب رادن رحمت جب جاوا پہنچے تو ایک عرب درویش نے ان کو دیکھتے ہی پیشگوئی کی کہ وہ جاوا میں اشاعتِ اسلام کے بانی ہوں گے، امپل میں رادن رحمت کا مدرسہ جسے کہیں کہیں آشرم کا نام بھی دیا گیا ہے آگے چل کر نہ صرف علومِ اسلامی کی ایک بڑی درسگاہ بن گیا بلکہ اشاعتِ اسلام کا اہم مرکز تھا اور جاوا کے کئی ولی یہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۴۵۶ء میں رادن رحمت کے لڑکے مخدوم ابراہیم پیدا ہوئے جو بڑے ہوکر اپنے والد کی طرح مشہور مبلغ ہوئے اور سنان بونانگ SUNAN BONANG کا لقب پاکر مشہور ولیوں میں شمار کئے جانے لگے، رادن رحمت نے امپل میں ۱۴۶۷ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا اسحٰق | رادن رحمت کے زمانے میں بیرونِ ملک سے آنے والے تاجروں کے قافلہ کے ساتھ ایک مولانا اسحٰق سماترا آئے تھے، جو بڑے باکرامت بزرگ بتائے گئے ہیں۔ سماترا میں مولانا اسحٰق نے جب سنان امپل کی تبلیغی

(بقیہ ص ۳۵) جاگیرداروں اور امراء کا خطاب ہوا کرتا تھا اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ولیوں کو معاشرہ میں کیا رتبہ حاصل تھا، آج کل اس لفظ کے معنی 'عزت مآب' یک محدود ہوگئے ہیں۔

سرگرمیوں کا حال سنا تو جاوا کا سفر کیا اور بالم بنگن BALEMBANGAN کو اپنی تبلیغی مہم کے لئے چنا۔ بابد (تواریخ جاوا) میں مولانا اسحٰق کا بڑے احترام سے ذکر ہے، اس تذکرہ میں مولانا کا نام ابراہیم اسمارا لکھا ہے اور ان کے والد کا نام کہیں زین الاکبر اور کہیں زین الکبری بتا کر اس کا شجرہ زین العابدین بن سیدنا حسینؓ تک ملایا گیا ہے، اس تذکرہ کے مطابق مولانا اسحٰق نے بالم بنگن (مشرقی جاوا) پہونچکر سلانگو SELANGU کے پہاڑ پر اقامت کی اور خدا سے تبلیغ اسلام کی توفیق عطا کرنے کی دعا کرنے لگے، انھیں دنوں اس علاقے میں ایک زبردست وبا پھیلی بالم بنگن کے راجہ منک سمبویو MINAK SEMBOJO کی لڑکی سکردادو SEKAR DADU بھی اس وبا میں مبتلا ہوئی۔ راجہ نے تمام علاج سے مایوس ہوکر اعلان کیا کہ جو شخص بھی شہزادی کو صحت یاب کرے گا وہ اُسے اپنے ایک دائرہ کی حکومت سونپ دے گا اس پر بھی کوئی سامنے نہ آیا تو اس نے اپنے ایک عمّال پاتی باجو سنگورو PATIH BADJU SENGORO کو حکم دیا کہ وہ پہاڑ پر تلاش کرکے تپسیا کرتے ہوئے کسی رشی کو بلا لائے پاتی کو ایک عرصہ تلاش کے بعد سلانگو پہاڑ پر ایک تیز روشنی دکھائی دی قریب جاکر معلوم ہوا کہ وہاں ایک بزرگ سفید لباس پہنے عبادت میں مشغول ہیں، یہ بزرگ مولانا اسحٰق تھے انھوں نے نماز کے بعد پاتی کی بات سُنی تو شہزادی کو شفا دینے کا دعویٰ کیا بشرطیکہ راجہ اسلام قبول کرلے۔ راجہ نے اپنی بیٹی کی محبت میں اس شرط کو منظور کرلیا اور مولانا کی محض دو رکعت نماز سے اس شہزادی کو شفا ہوگئی۔ راجہ نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اپنی اسی لڑکی کی شادی مولانا سے کردی اور بالم بنگن کی حکومت انھیں سونپ دی، اس صورتِ حال نے مولانا کی بڑی مدد کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں کثیر تعداد میں لوگ داخلِ اسلام ہوگئے نہ صرف یہ بلکہ راجہ کے اسلام قبول کرنے کے اثر سے تمام شاہی خاندان کی توجہ بھی اسلام کی جانب مائل ہوگئی لیکن کہا جاتا ہے کہ خود راجہ منک لمبویو نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا چنانچہ مولانا اسحٰق کی بڑھتی ہوئی شہرت اور اسلام کا چرچا ہوتے دیکھ کر اس کے دل میں بد دیانتی آئی وہ دو بدو تو مولانا کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا البتہ چوری چھپے اس نے مولانا کے خلاف سازش شروع کردی اور اُن کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگا کچھ عرصہ میں مولانا کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے اور آخر کار حالات اتنے ناسازگار ہوگئے کہ مولانا کو جاوا چھوڑ کر پسئی واپس چلا جانا پڑا۔ جہاں انھوں نے ایک مدرسہ کھولا۔

مولانا اسحٰق کو سُنان کا لقب تو نہیں ملا لیکن ولیوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور "شیخ علوالاسلام" کے لقب سے مشہور ہیں۔

باقی